کے حال زار پر ہر وقت کڑھا کرتے اور اصلاح حال کی ہر عملی تدبیر میں لگے رہتے۔ یونیورسٹی کے نام سے جب "مسلم" حذف کر دینے کی تجویزیں ان کے کان میں پڑیں تو فرط غیرت سے تڑپ گئے اور بول اٹھے کہ میری زندگی بھر تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ مشیت الٰہی نے انھیں عین ایسے وقت اٹھا لیا جب یونیورسٹی کو ان کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ اللہ مغفرت بال بال فرمائے۔

قائد ملت

○

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت اگر آج ہی کل میں آ گئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے؟ نام کئی ایک ذہن میں آئے لیکن سب سے پہلا نام ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اسلام بہادر خاں حیدرآبادی کا تھا۔۔ کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے پھرتے پھراتے عین اس وقت اتفاق سے آ موجود ہوتے! ایسا کیوں ہونے لگا۔ لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں! — یہ تھی اس نامۂ سیاہ کے دل میں اس شیردل مجاہد ملت کی محبت، عظمت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جا رہی تھیں، کسے وہم گزر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا!

صدق جدید جولائی ۱۹۴۴ء

اور جس کی دعاؤں کے لئے یہ طالب و تمنائی تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا !!............ آہ مشتِ خاکِ انسان اور اس کے تارِ عنکبوت جیسے بودے، پھسپھسے، کمزور ارادے، حوصلے، سہارے !

۴۰ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی ! اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج، خوش سیرت، خوش صورت، بلا کے ذہین و نکتہ رس، کسی بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول، چمن بھر کو مہکاتا ہوا بات کی بات میں نذرِ خزاں ہو جائے گا ؟ محفل بھر کو منور رکھنے والی شمع اسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے !! — کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی نہ سکرات نہ تکلیفیں نہ نزع روح کی سختیاں اور کیوں ہوتیں جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکارنے پر معاً لبیک آخر کیوں نہ کہتی ؟ تاخیر و تامل کی وجہ ایک منٹ کے لئے بھی آخر اسے کیا ہو سکتی تھی . ؟ —— رہبر دکن والے رہبرِ ملت کی دو سال اندر کی فوری موت کا راز بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا، جو دنیا میں نقیب تھا اس سے آخرت میں بھی نقیب ہی کا کام لیا گیا اور عجب کیا جو دنیا میں خدمتِ ملّت کے دیوانے اور فلاحِ اُمت کی خاطر ایک دوسرے کے دست و بازو، رفیق، ہمراز و ہمساز تھے، انھیں جنت میں بھی ان کی خواہش پر یہی مشغلہ تفریح دے دیا گیا ہو، جو یہاں محمدؐ کے دین کا سودائی تھا عجب تھا کہ جنت کی ہواؤں نے اس کو تیز سے تیز تر کیا ہو !

حیدرآباد کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ جس نے آج سے ۲۰-۲۲ سال پہلے کیا ہے . وہ آج ان حیدرآبادیوں کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اتنے دنوں میں اس کی کایا پلٹ کس نے کر دی ؟ جو قوم سرتاسر بے عمل، مجہول، افسردہ، منتشر اور پست مذاق اور بدنظمی کا شکار تھی، اس میں عمل، تنظیم، انضباط کی برقی رَو کس نے دوڑائی ؟ یہ مُردوں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی کس نے کر دکھائی ؟ حیدرآبادی مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے شرم سے نہیں فخر سے پیش ہو سکنے، یہ قلبِ ماہیت کس نے کر دی ؟ اور جو دکن اجتماعی اور ملی زندگی میں سبق لینے کے قابل

مولوی احمد محی الدین مرحوم ایڈیٹر رہبر دکن (حیدرآباد)

بھی مشکل سے تھا اسے سبق دینے کے قابل کس نے بنا دیا۔ سارا کارنامہ قلم لکھنے چلا تھا کہ اعجازی کارنامہ اسی مرنے والے زندہ جاوید بہادر خاں اور اسی کے چند مخلص رفیقوں ہی کے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا ——— قائد ملت جس کسی نے اسے کہا اس نے کوئی شاعری نہیں کی ادبی صنعت گری لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ایک حقیقت بیان کردی۔ تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اٹکل کھری۔ قائد ملت (او آج یہ لفظ بھی بار صدق استعمال کر رہا ہے) کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علیؒ کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا۔ ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی وہی ہمت و عزم۔ غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے اور سب کچھ وہی ——— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آئی (سننا" اس لئے کہ شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو برابر یہی اطمینان رہتا تھا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علی گڑھ یونی ورسٹی کی مجلس تاریخ و تمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب دونوں کا بیان ہونے والا تھا۔ نواب سحر بیان کی خطابت بچہ بچہ سے خراج تحسین حاصل کئے ہوئے، اہل جلسہ نے غلطی اور شدید غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ وسیع اور لق و دق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک کھچا کھچ بھرا ہوا۔ سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اس نے جواب دیدیا۔ اب بھلا میری آواز کیا پہونچتی۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے کچھ سنائی نہیں دیتا اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی بیٹھے پر آمادہ تھا فوراً صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا۔ مگر نواب صاحب کھڑے ہو گئے اور گرج کر بولے کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے لکچر کو اول سے آخر تک سنوں گا۔ میں تو انھیں کا لکچر سننے آیا ہوں اور جب تک وہ اپنا لکچر

ختم نہ کرلیں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کرونگا:

مجمع میں سناٹا چھا گیا تھا! ـــــــ ہے کہیں اس دور میں اس شرافت کی مثال ـــ ؟

۶ اپریل ۱۹۴۲ء لکھنؤ میں نواب صاحب یوم اقبال کی صدارت کرکے ندوہ میں ڈالی باغ میں گنگا پرشاد میموریل ہال میں متعدد جلسوں میں معرکہ کی تقریریں کرکے صبح کی گاڑی سے براہ دہلی حیدرآباد واپس جارہے ہیں میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہونچا ہوں خیال یہ ہے کہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی، موٹر اسٹارٹ ہوتا ہے ادھر نواب صاحب کی زبان دعاؤں پر کھلتی ہے، سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی، ابھی ختم ہوئی جاتی ہے لیکن یہ کیا؟ کہاں ابھی ختم ہوئی، دو سکنڈ چار سکنڈ، ایک دو دعائیں، یہ سلسلہ ہے کہ ختم ہونے ہی آتا، اور دعائیں زیادہ تر حدیث کی، یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین کی قسم کی کوئی کتاب! شرم سے کٹا جارہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم اور مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں، یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی یاد نہیں! ان کا ورد سفر تک میں رکھنا تو خیر الگ رہا یہاں تو یاد بھی نہیں! اب انتظار کہ نواب صاحب کا خشوع و خضوع کچھ کم ہولے تو ادھر اہل دنیا کی زبان کھلے مگر تو یہ اس کا موقع ہی کیوں آنے لگا۔ دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا، نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا! ـــــ ایک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کرکے اور کسی لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا صوبہ وار مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال تو نہ اس کے قبل اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی نہ اس کے بعد۔

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر

ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

خوش نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلبر و باہمت سپاہی آرہا ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا، بےکسوں کا والی تھا، ملت کا پشت پناہ، وہ ایک امیر

گھرانے کا چشم وچراغ تھا اور مجھ سے ان سے پہلی ملاقات جب حیدرآباد میں غالباً ۱۹۲۹ء
میں میرے عزیز ترین دوست اور میرے مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کے مکان پر مولانا
عبدالرحیم صاحب (سابق انجمن اسلامیہ والے اور حال تفسیر القرآن والے) کی وساطت سے
ہوئی تھی تو میں بس اس قدر سمجھا تھا کہ ایک خوش مذاق و علم دوست نوجوان ہیں!
(ان کے نفس موثر کی چمک دمک آج تک یاد ہے) دل و دماغ روح و ضمیر کے یہ حیرت انگیز
اور قابل صد رشک جوہر تو رفتہ ہی رفتہ کھلے۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ کیسے کیسے
باغی، وطاغی، غدار و سرکش، اسّی بچاسّی کی عمروں کے پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی کے
دن پورے کر رہے ہیں اور یہ مطیع و فرمانبردار بندۂ دین کا سپاہی، اور امت کا علمبردار چالیس
ہی کی عمر میں ہی واپس بلالیا جاتا ہے سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا۔ ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

روایتوں میں آیا ہے کہ خلیفہ برحق عمر فاروق رضؓ نے جب عین میدان قتال میں خالد رضؓ
سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ لوگوں کا تکیہ حق تعالیٰ سے
زیادہ خالد پر ہو چلا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالدؓ کی
شجاعت و تدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں — عجب کیا، جو ایک مصلحت
کچھ اس طرح کی اس جوانمرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو، ملت بہت زیادہ تکیہ اس بندۂ
حق پر کر چلی تھی اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور رہو کہ جو خدائے قادر و توانا ایک
بندہ کے توسط سے نصرت و کامرانی پر قادر ہے، وہی اسی واسطے کے بغیر بھی اسی طرح
قادر و متصرف ہے۔